مرکزِ تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کی

دیگر مطبوعات

جج، منصف، مجسٹریٹ، وکلا، علماء، دینی مدارس اور قانون کے طلبہ کیلئے نادر تحفہ

اسلام کا قانونِ شہادت

جلد اول (حصّہ فوجداری)

تالیف

مولانا سید محمد متین ہاشمی صاحب

ریسرچ ایڈوائزر

✷

حُدود و قصاص اور جملہ فوجداری مقدمات میں اسلام کے قانونِ شہادت کا اجراء کیسے ہوگا اور موجودہ دور میں اس کو کس طرح نافذ کیا جائے گا؟

اعلیٰ جلد، گلیز پیپر، صفحات ۴۰۲ قیمت ۵۵/۰۰ روپے

نادر مخطوطات کے تفصیلی کوائف محققین کیلئے قیمتی تحفہ

فہرست مخطوطات

دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری

(تالیف و ترتیب)

مولانا سید محمد متین ہاشمی ایم۔اے

ریسرچ ایڈوائزر

ساجد الرحمٰن صدیقی و حافظ غلام حسین

جلد اول، قیمت مجلد ۴۰/۰۰ پیپر بیک ۳۰/۰۰ روپے

فہرست مخطوطات جلد دوم مجلد ۵۰/۰۰ پیپر بیک ۴۰/۰۰ روپے

فہرست مخطوطات جلد سوم مجلد ۶۰/۰۰ پیپر بیک ۵۰/۰۰ روپے

فہرست مخطوطات جلد چہارم (زیرِ طبع)

اُردو زبان میں اپنے موضوع پر سب سے پہلی کتاب

اسلامی حُدود اور اُن کا فلسفہ

مع

اسلام کا نظامِ احتساب

تالیف

مولانا سید محمد متین ہاشمی ریسرچ ایڈوائزر

قیمت چھ روپے

اسلامی نظامِ عدل کا نفاذ

مُشکلات

اور

اُن کا حل

تالیف

مولانا سید محمد متین ہاشمی صاحب ریسرچ ایڈوائزر

زیرِ طبع

ملنے کا پتہ: مرکزِ تحقیق، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، نسبت روڈ، لاہور ٹیلیفون ۳۱۰۴۶۹

انہیں پاکستان کا وجود ایک آنکھ نہیں بھاتا محض اس لیے کہ یہ سرزمین صرف چشموں، دریاؤں، ندیوں، نالوں، کھیتوں اور باغوں ہی کی سرزمین نہیں ہے یہ سرزمین مسجد کی طرح مقدّس ہے۔ اس کے ہر ہر ذرّے پر خون شہداء کی مہر لگی ہوئی ہے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کر کے یہ زمین حاصل کی تھی کہ "ہم اسے اسلام کی تجربہ گاہ بنائیں گے" پاکستانی ملّت کو خدا سے کیا ہوا وعدہ نبھانا ہوگا اور اللہ کے نازل کردہ نظام حیات کو یہاں پورے خلوص کے ساتھ نافذ کرنا ہوگا بزرگوں نے جان دے کر مال لٹا کر۔ اپنے گھروں کو اجاڑ کر اپنی عزت و آبرو کے آبگینوں کو چکنا چور کرا کر۔ اپنی راتوں کی نیند اور دن کے سکون کو تباہ کر کے یہ امانت پاکستان کی نئی نسل کو سپرد کی ہے ان کا جو فرض تھا انہوں نے ادا کر دیا ایک آزاد زمین ایک آزاد آسمان اور ایک آزاد فضا بہم پہنچا دی اس کی حفاظت اس میں اسلام کی آبیاری اور دین قویم کی عظمت کے پرچم کو سربلند کرنا نئی نسل کے ذمّے بزرگوں کا قرض ہے یقین ہے کہ باوجود بے پایاں مشکلات اور غیر متناہی موانع کے نئی نسل اس امتحان سے اپنے عزم جواں، جہد پیہم اور ایمان کامل کی بدولت کامیاب گزرے گی مگر اس کے لیے ایک اور صرف ایک شرط ہے۔

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں
شرطِ اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

شروع کیں۔

کوئی کہنے لگا کہ پاکستان معاشی ضرورت کے تحت عالم وجود میں آیا تھا۔ اس لیے اس کے قیام کا مقصد صرف معاشی ناہمواری کو دور کرنا ہے۔ کسی نے لسانی بنیادوں پر بنگالی قومیّت کا نعرہ بلند کر دیا۔ کسی نے کہا کہ دو قومی نظریہ غلط ہے۔ پاکستان میں پانچ قومیں اور پانچ زبانیں ہیں۔ بلوچ قوم۔ سندھی قوم۔ پنجابی قوم اور بنگالی قوم۔ قومیتوں کے ان نعروں کا مقصود صرف وحدت ملی کو پارہ پارہ کرنا ہے۔ ورنہ یہ قومیں اس وقت کہاں تھیں جب قائد اعظمؒ نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا بنگالی قومیّت کے نعرے کو ایک بنگالی غدار مجیب الرحمٰن نے ہندوؤں کی امداد اور بھارت کی سازش سے کچھ اس طرح فروغ دیا کہ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان پاکستان سے کٹ کر بنگلہ دیش بن گیا اور مشرقی پاکستان کے بنگالی آج تک اپنی اس غلطی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ اس بچے کھچے پاکستان کو جواب بھی اقوامِ عالم کی صفوں میں ایک اہم مقام کا مالک ہے اس نظریہ سے وابستہ رکھا جائے جو اس کا اساسی نظریہ ہے اور جس نظریے کے تحفظ کی خاطر لاکھوں انسانوں نے قربانیاں دی ہیں قومیں اپنے اساسی نظریات کی بنیاد پر باقی رہتی ہیں۔ ہمارا ملک ایک نظریاتی مملکت ہے اور اس کی اساس اسلام اور صرف اسلام ہے۔ آج ساری دنیا کی طاغوتی طاقتیں اس فکر میں لگی ہوئی ہیں کہ پاکستانی ملّت کو اس کے اساسی نظریات سے محروم کر دیا جائے

جانکاہ حادثہ

اللہ تعالیٰ ہی اپنی مصلحتوں کو بہتر جانتا ہے لیکن پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ اس دن پیش آیا جب ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو محض ایک سال تک پاکستان کے نظام کو درست کرنے کے بعد اس کشتی کے ناخدا حضرت قائد اعظمؒ سفر آخرت پر روانہ ہو گئے ؎

رفتم واز رفتن من عالمے تاریک شد

من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم

حضرت قائد اعظمؒ کی وفات کے بعد قائد ملت لیاقت علی خاں نے زمام اقتدار سنبھالی لیکن ایک سازش کے تحت انہیں راولپنڈی میں شہید کر دیا گیا۔ اس کے بعد ملک میں سیاسی ابتری پھیل گئی۔ رہبر ہی رہزن بن گئے اور قوم پاکستان کے نصب العین سے دور سے دور تر ہوتی چلی گئی۔ بھارت نے جب دیکھا کہ پاکستانی قوم سیاسی بحران میں مبتلا ہے تو اس نے بارہا پاکستان کی سرحدوں پر حملے کئے جس میں سب سے بڑا حملہ ۱۹۶۵ء میں کیا گیا لیکن پاکستانی قوم اور پاکستانی افواج نے میدان جنگ میں بھارت کے چھکے چھڑا دیئے۔ تب بھارت نے پینترا بدلا اور ملک کی سرحدوں سے منہ موڑ کر اس نے پاکستان کی نظریاتی سرحدوں پر حملے شروع کر دیئے اور مشرقی و مغربی پاکستان میں بیک وقت اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ طرح طرح کی گمراہ کن باتیں پھیلائی

لڑتے رہے یہاں تک کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو " دیوانے کا خواب"
ایک حقیقت ثابتہ بن کر پاکستان کی شکل میں دنیا کی سب سے بڑی
اسلامی سلطنت کی حیثیت سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا"

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو شاہ ولی اللہؒ کا خواب پورا ہوا سید احمدؒ بریلوی کی قربانیوں کا صلہ ملا۔ سرسید کی مدبرانہ پیش گوئی نے لباس حقیقت زیب تن کیا۔ اور دو قومی نظریہ " اسلام اور کفر" کی تفریق کے نظریے کی اساس پر پاکستان عالم وجود میں آیا۔ کم ظرف اور بزدل ہندوؤں نے اقلیتی صوبوں سے پاکستان کا مطالبہ کرنے کا انتقام لیا۔ لاکھوں انسان قتل کیئے گئے تقریباً ایک کروڑ آدمی بے گھر ہوئے۔ مسلمانوں کی مسجدوں کو اصطبل بنایا گیا۔ مسلمان عورتوں کی آبرو ریزی کی گئی ہزاروں بچوں کو اچھال کر نیزوں کی انیوں میں پرولیا گیا مسلمان بچیوں کے ننگے جلوس نکالے گئے۔ دہلی کی جامع مسجد کا مینار خاموش کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا۔ عالمگیر و شاہجہان کی ارواح غمزدہ ہوتی رہیں۔ ابلیس ننگا ناچ ناچتا رہا یہ سب اس لیے کیا گیا تاکہ مسلمانوں کو سرحد پار اتنی بڑی تعداد میں دھکیل دیا جائے کہ پاکستان کی معیشت تباہ ہو جائے اور مسلمان دوبارہ ہندوؤں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں لیکن اسلام کا نشہ وہ نشہ نہیں ہے جسے ترشی اتار دے۔ اس کی حقیقت تو یہ ہے کہ ؎

برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

پاکستان نے سارے حملے سہار لیے اور اللہ کے فضل و کرم سے آج بھی اقوامِ عالم کے درمیان ایک باوقار قوم کی حیثیت سے زندہ ہے۔

تھا نہ دہلوی نہ کوئی بنگالی تھا نہ پنجابی نہ کوئی بریلوی تھا نہ دیوبندی نہ کوئی شیعہ تھا نہ سُنّی نہ کوئی امیر تھا نہ غریب نہ کوئی افسر تھا نہ ماتحت سارے تفرقے مٹ گئے۔ ساری دیواریں ڈھے گئیں۔ اب جنوبی ایشیا میں صرف ایک ملّت بستی تھی جس کا نام تھا ملّت اسلامیہ جس کا اللہ ایک جس کا رسولؐ ایک جس کا قرآن ایک اور جس کا کعبہ ایک تھا۔ زمین کی طنابیں کھنچ گئیں فاصلے سمٹ گئے۔ دلوں سے دل اور روحوں سے روحیں مل گئیں۔ کسان کھیتوں سے علماء مساجد سے مشائخ خانقاہوں سے طلبہ کالجوں سے عورتیں حرم سراؤں سے تاجر بازاروں سے مزدور کارخانوں سے وکلاء عدالتوں سے مسلمان سپاہی تھانوں سے غرضکہ جو جہاں تھا وہاں سے نکل پڑا سب کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا کہ "لے کے رہیں گے پاکستان بٹ کے رہے گا ہندوستان" سب کے ہاتھ میں ایک ہی پرچم تھا مسلم لیگ کا پرچم ساری قوم سپاہی تھی اور محمد علی جناح سپہ سالار ڈیڑھ سو سال کی غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے لگیں۔ برطانوی سامراج کے قصر میں لرزہ پڑ گیا وہ ہندو رہنما جو مسلمانوں کو غلام بنانے اور انہیں "شدھ" کر کے دوبارہ ہندو بنا لینے کے خواب دیکھ رہے تھے اسلام کے اس جاہ و جلال کو دیکھ کر ششدر رہ گئے انہوں نے چڑ کر کہا کہ:

"پاکستان کسی دیوانے کا خواب یا مجذوب کی بڑ ہے" بھلا مذہب کی بنیاد پر بھی کوئی ملک قائم ہو سکتا ہے لیکن قوم کے اتحاد۔ ایمان اور تنظیم کی طاقتوں کے ساتھ مسلمان پاکستان کی جنگ

ہند کے مسئلے کی نوعیّت محض فرقہ وارانہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک بین الاقوامی نوعیّت کا مسئلہ ہے اور اسی حیثیّت سے اسے زیرِ بحث لانا چاہیے ہندو اور مسلمانوں کا تعلق دو مختلف تہذیبوں سے ہے جن کی بنیاد باہمد گر متصادم خیالات اور نظریات پر ہے ایسی اقوام کو ایک واحد مملکت کا حلقہ بگوش بنانے سے جس میں ایک قوم آبادی کے لحاظ سے اقلیّت میں ہو اور دوسری اکثریت میں لازماً بے چینی اور کشمکش میں اضافہ ہوگا اور بالآخر وہ ڈھانچہ ہی تباہ ہو جائے گا جسے ایک ایسی مملکت کی حکومت کے لیے معرض وجود میں لایا گیا ہوگا۔

یہی وہ مشہور زمانہ "دو قومی نظریہ" ہے جس پر قائد اعظم علیہ الرحمۃ نے مملکت پاکستان کی اساس قائم کی۔ قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد گم کردہ راہ کارواں کو نشان منزل ملا۔ ڈیڑھ سو برس سے ملّت اسلامیہ ہند جس گرداب اور نظریاتی بحران میں گرفتار تھی ۲۳ مارچ کو اس بحران سے نکلی اور قرارداد پاکستان اسلامیان ہند کے دل کی آواز بن گئی۔ کانگریس نے انتہائی غیض و غضب کے عالم میں اسے مسترد کر دیا گاندھی نے اعلان کیا کہ "بھارت ماتا کے ٹکڑے کرنا گئو ماتا کے ٹکڑے کرنے کے برابر ہے" ہندو پریس برطانوی عیاری، ہندو بنیوں کی دولت، فرقہ وارانہ فسادات کی آگ غرض ہر ہر حربہ استعمال کیا جانے لگا لیکن جب ایمان و یقین والوں کا قافلہ جادہ پیما ہوا تو پھر اس سیل رواں کے آگے کوئی طاغوتی طاقت ٹھہر نہ سکی۔ اب نہ کوئی سندھی تھا نہ بلوچی نہ کوئی پٹھان

ان کی تشکیل ایسی آزاد ریاستوں کی صورت میں کی جائے جن کی مشمولہ وحدتیں خود مختار اور مقتدر ہوں۔

نیز ان وحدتوں اور خطوں میں اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، معاشی، سیاسی انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کا مناسب و مؤثر اور حکمی تحفظ ان کے مشورے سے آئین میں صراحت کے ساتھ کیا جائے اور ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں انکے اور دیگر اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، معاشی سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کا مناسب و مؤثر اور حکمی تحفظ ان کے مشورے سے آئین میں صراحت کے ساتھ کیا جائے۔

مزید برآں یہ اجلاس مجلس عاملہ کو اختیار دیتا ہے کہ وہ ان بنیادی اصولوں کے مطابق آئین کا ایک ایسا منصوبہ مرتب کرے جس کی رُو سے مذکورہ علاقوں کو بالآخر کلی اختیارات حاصل ہو جائیں مثلاً دفاع، امور خارجہ، مواصلات محصولات اور دیگر ایسے امور جو ضروری سمجھے جائیں۔

اس قرارداد کے بنیادی نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے واشگاف انداز میں دو قومی نظریہ پیش کیا:

”اس بات کو غلطی سے مان لیا گیا ہے کہ مسلمان ایک اقلیت ہیں، مسلمان ہرگز ایک اقلیت نہیں ہیں مسلمان ہر لحاظ سے ایک قوم ہیں ہند میں ایک وحدانی حکومت ڈیڑھ سو برس میں جو کچھ حاصل نہ کر سکی ایک مرکزی وفاقی حکومت کو ٹھونسنے سے اسے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ الا یہ کہ مسلح افواج کے ذریعہ سے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس پرزور اعادہ کرتا ہے کہ وفاقی منصوبہ جس کا اظہار گورنمنٹ آف انڈیا ۱۹۳۵ء ایکٹ میں کیا گیا ہے قطعاً غیر موزوں اور اس ملک کے خاص حالات کے پیش نظر ناقابل عمل اور مسلم ہندوستان کے لیے یکسر ناقابل قبول ہے۔

۲۔ اس اجلاس کی یہ حتمی رائے ہے کہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو جو اعلان وائسرائے نے حکومت ملک معظم کی جانب سے کیا تھا وہ اس حد تک تو اطمینان بخش ہے کہ جس مسلک اور منصوبے پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء مبنی ہے۔ اس پر ہندوستان کی مختلف جماعتوں، مفادات اور فرقوں کے مشورہ سے دوبارہ غور کرنے کا یقین دلایا گیا ہے۔ لیکن مسلم ہندوستان اسوقت تک مطمئن نہیں ہو گا جب تک کہ پورے آئینی منصوبے پر از سر نو غور نہ کیا جائے، اور کوئی نیا منصوبہ مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو گا تاوقتیکہ وہ ان کی رضامندی اور منظوری سے نہ مرتب کیا جائے۔

۳۔ قرار پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی یہ مسلمہ رائے ہے کہ کوئی آئینی منصوبہ اس ملک میں قابلِ عمل اور مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہو گا۔ تاوقتیکہ وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصول پر وضع نہ کیا گیا ہو۔ یعنی جغرافیائی طور پر متصل وحدتوں کی حد بندی ایسے خطوں میں کی جائے کہ (مناسب علاقائی ردّ و بدل کے ساتھ) جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے مثلاً ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی حصے

لکھنو میں ہوا اس میں مسلمانوں کی صفوں میں حقیقی اتحاد کے وہ دل فریب مناظر دیکھنے میں آئے جنہیں دیکھنے کی خواہش میں عرصہ دراز سے چشم فلک سرگرداں تھی۔ سرسکندر حیات وزیر اعلیٰ پنجاب مولوی فضل حق وزیر اعلیٰ بنگال سر محمد سعد اللہ وزیر اعلیٰ آسام نے مسلم لیگ کی حمایت کا وعدہ کیا اور قائد اعظم علیہ الرحمۃ کی قیادت کو تسلیم کر لیا۔ اس اجلاس کے بعد مسلم لیگ نہایت تیزی سے عوامی جماعت بننے لگی اور ہر صوبے میں کثیر تعداد میں مسلم لیگ کی شاخیں قائم ہو گئیں۔

قرار دادِ پاکستان

قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں بہت جلد مسلم لیگ نے عوام کے موثر ترجمان بننے کی صلاحیت پیدا کر لی تاآنکہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو اقبال پارک لاہور میں مسلمانان جنوبی ایشیا کا عظیم اجتماع منعقد ہوا جس میں شہرہ آفاق "قرار داد پاکستان" بنگال کے وزیر اعلیٰ مولوی اے۔ کے فضل حق نے پیش کی اور چوہدری خلیق الزمان نے اس کی تائید کی۔ قرار داد اتفاق رائے سے منظور کر لی گئی وہ قرار داد یہ تھی۔

قرار دادِ لاہور ۲۲، ۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء

۱۔ آئینی مسئلے پر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور مجلس عاملہ کے اس اقدام کی توثیق و تائید کرتے ہوئے جو ان کی ۲۷ اگست، ۱۷، ۱۸ ستمبر، ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء اور ۳ فروری ۱۹۴۰ء کی قرار دادوں سے واضح ہوتا ہے۔

چھین لیں فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعے ان پر خوف و ہراس طاری کرنا چاہا۔ ان کی زبان سے ان کا رشتہ منقطع کرنے کی کوشش کی۔ غرضیکہ جو بھی ان کے بس میں تھا انہوں نے کر لیا اور یہ سمجھا کہ اس طرح وہ مسلمانوں کو کفر کے آستانے پر جبہ سائی کرنے پر مجبور کر دیں گے۔ مگر مصائب و آلام اور امتحان و ابتلاء کی اس بھٹی سے مسلمان کندن بن کر نکلے جو مسلمان اب تک متحدہ قومیت کا خواب دیکھ رہے تھے ان کی آنکھوں سے پردے ہٹ گئے اور جو ہندو کے مکر کے جال میں پھنسے ہوئے تھے ان پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ:

الکفر ملّۃ واحدۃ والاسلام ملّۃ واحدۃ

(کفر ایک الگ ملّت ہے اور اسلام ایک الگ ملّت)

جس طرح نور و ظلمت، آب و آتش اور حق و باطل کا یکجا جمع ہو جانا ناممکن ہے اسی طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کے سارے نعرے کھوکھلے، گمراہ کن اور ملّت اسلامیہ کے لیے سم قاتل ہیں ہندو آخر کار ہندو ہوتا ہے آٹھ سو سال تک مسلمان حکمرانوں نے اس کے ساتھ رواداری برتی اسے حکومت میں شریک کیا۔ اس کے معابد کا احترام کیا۔ اس کی تہذیب کو لعل و گہر سے بھر دیا لیکن اس کا عناد دور نہ ہو سکا اور ہر دور میں اس نے باطنی خبث اور قلبی عداوت کا مظاہرہ کیا لہٰذا اب مسلمان رہنماؤں کو ہوش آ گیا اور پھر اسی قائدؒ کی طرف بڑھے جو عزم کا کوہ گراں اور یقین و ایمان کا پیکر تھا۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کا جو اجلاس

کی متعصبانہ ذہنیت کا مظاہرہ اقتصادی میدان میں بھی بھرپور ہوا مثلاً صوبہ یوپی اور بہار میں اکثریت مسلمان زمینداروں کی تھی اور مزارعین اکثر ہندو تھے اس لیے ان صوبوں میں مزارعین کے حقوق کے تحفظ کے نام پر زمینداریاں ختم کر دی گئیں اور مزارعین کو زمین کے مالکانہ حقوق دیدیئے گئے لیکن بنگال میں چونکہ زمینداروں کی اکثریت ہندو اور مزارعین کی اکثریت مسلمان تھی اس لیے وہاں زمینداری اور تعلقہ داری کا نظام برقرار رکھا گیا۔ اسی طرح پنجاب میں جہاں ہندو مہاجن مسلمان کسانوں کا استحصال کر رہے تھے جب دیہی قرضوں کا بوجھ ہلکا کرنے کی تجویز پیش کی گئی تو کانگریس نے اس کی شدید مخالفت کی۔

نقاب اُتر گئی اور حقیقت عیاں ہو گئی

فارسی میں ایک مثل ہے ؎

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

یعنی اللہ تعالیٰ جب مہربان ہوتا ہے تو کسی دشمن کی دشمنی کو کسی شخص یا قوم کے لیے سامان خیر بنا دیتا ہے گو کہ کانگریسی وزارتوں نے اپنے ڈھائی سالہ تاریک دور میں مسلمانوں پر بے شمار مظالم کیے ان کی روایات سے انکا رابطہ توڑنا چاہا۔ ان کی نظریں کعبے سے ہٹا کر کاشی کی طرف مرکوز کرنی چاہیں ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا انہیں ملازمتوں سے محروم کیا ان کی زمینداریاں

کہا جا سکتا ہے۔

۷۔ کانگریس راج کے دوران تقریباً تمام ہندوستان میں ہندو مسلم فساد کی آگ بھڑکتی رہی۔ اس لیے کہ کانگریسی حکومت نے اپنے علاقے میں ہندوؤں کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی کہ وہ جس مسلمان کو چاہیں تشدّد کا نشانہ بنائیں۔ قتل و غارت اغوا اور آبرو ریزی کی وارداتیں تو آئے دن کا معمول بن گئی تھیں۔ یوپی سی پی۔ بہار اور بمبئی ان فسادات کے مرکز بن گئے تھے اسی دوران سی پی کے ایک گاؤں لبوچاندرو میں ایک بدنام شخص جگدیو پٹیل نے جو علاقائی کانگریس کا صدر بھی تھا۔ عین نماز کی حالت میں مسلمانوں کی ایک مسجد پر حملہ کر دیا اور چند نمازی زخمی کئے ناچار مسلمانوں نے اس شخص کو قتل کر دیا۔ بس پھر کیا تھا معلوم ہوا کہ قیامت آگئی صوبائی حکومت کی ساری مشینری حرکت کرنے لگی مسلمان بیچارے زخمی بھی ہوئے تھے مارے پیٹے بھی گئے تھے اُلٹے گرفتاری بھی انہیں کی ہوئی اور اس فساد میں ڈیڑھ سو افراد کو گرفتار کیا گیا۔ دو مسلمان پولیس کانسٹیبل بھی تشدد کا نشانہ بنے مقدمہ چلا اور ۴ مسلمانوں کو پھانسی اور ۴۴ افراد کو عمر قید کی سزا دی گئی مقدمہ جب اپیل میں گیا تو انگریز جج نے سب کو رہا کر دیا۔

۸۔ مذکورہ بالا سارے اقدامات اس لیے کئے جا رہے تھے کہ مسلمانوں کو ان کے مذہب اور تہذیب و ثقافت سے بیگانہ کر کے رفتہ رفتہ انہیں ہندو بنا لیا جائے لیکن معاملہ یہیں تک نہیں تھا بلکہ ہندو

کرنے اور ماضی سے ان کے روابط کو یکسر منقطع کرنے کی مکروہ کوشش تھی۔ وزارت سازی کے بعد کانگریس نے مسلم لیگ کو ختم کرنے کے لیے رابطہ مہم کا آغاز کیا اس مہم کا منصوبہ پنڈت جواہر لال نہرو نے بنایا تھا اور اسکے عزائم یہ تھے کہ اسلامی قومیت کے تصور کو مسلمانوں کے ذہن سے نکال کر انہیں جدید نظریات اور متحدہ قومیّت کے نظریات سے روشناس کرایا جائے۔ نہرو کا خیال تھا کہ اگر اسے کامیابی حاصل ہوگئی تو مسلم لیگ اپنی موت آپ مرجائے گی لیکن شاید نہرو کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ

ے اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

کانگریسی وزارتوں نے "ودیا مندر سکیم" بطور تعلیمی پالیسی کے جاری کی۔ اس پالیسی کے پس پردہ کیا مقاصد کارفرما تھے یہ لفظ "مندر" ہی سے مترشح ہوجاتا ہے درصل ہندو مذہب کی تبلیغ کی یہ ایک خطرناک سازش تھی۔ اس سکیم کے تحت طلبہ کو مجبور کیا جاتا کہ وہ گاندھی کی تصویر کے آگے ہاتھ جوڑیں۔ گھٹنے ٹیک کر اس کی عظمت کے گیت گائیں بمبئی کے مسلمانوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا اور جلوس نکالے لیکن انہیں دبا دیا گیا۔

کانگریس نے اپنی وزارتوں کے تمام صوبوں میں قانون گائے کشی کو ممنوع قرار دیدیا جسے مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں کھلی مداخلت

سے انکار کر دیا۔ کانگریس نے اپنے دورِ حکومت میں ایسے افسوسناک کارنامے انجام دیئے کہ ہندو استعماریت کے تمام عزائم بے نقاب ہو گئے۔

۱۔ وزارت سازی کے بعد سب سے پہلے کانگریس نے تمام سرکاری و غیر سرکاری عمارتوں پر کانگریسی پرچم لہرا دیا۔ جس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ کانگریس ہی ہندوستانی عوام کی نمائندہ جماعت ہے مسلمانوں کے لئے یہ ایک کھلا چیلنج تھا۔

۲۔ کانگریس نے "بندے ماترم" کو اپنا قومی نغمہ قرار دیا جس میں مسلم آزاری کا عنصر نمایاں تھا۔ کیونکہ یہ ایک متعصب ہندو بنگالی "بنکم چندر چٹر جی" کے ناول "انند ماتھ" کا جز تھا اس نغمے کا مفہوم یہ ہے کہ بھارت کی پاک زمین اپنے بیٹوں کو سلام بھیج کر ان سے یہ استدعا کرتی ہے کہ " مجھے ملیچھوں (ناپاکوں) کے قدم سے پاک کرو اور اس کے بیٹے اس کے سامنے جھک کر یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تجھے ایک نہ ایک دن پاک کر کے رہیں گے۔ مسلمان اس نغمے کی روح اور ملیچھ کے استعارے کو سمجھ رہے تھے اس لیے جب یہ پابندی عائد کی گئی کہ مسلمان بچے اسکولوں میں صبح کے وقت ہاتھ جوڑ کر ترنگے جھنڈے کے سامنے کھڑے ہوں اور یہ نغمہ الاپیں تو انہوں نے سخت احتجاج کیا اس کے باوجود کانگریسی حکومت نے اپنے رویّے میں تبدیلی نہ کی۔

۳۔ کانگریسی وزارتوں کی تشکیل کے بعد تمام صوبوں میں ہندی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا یہ گویا مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ تہذیبی ورثے کو تباہ

کانگریس راج

عین اس وقت جبکہ علامہ اقبالؒ الہ آباد میں نظریہ پاکستان پیش کر رہے تھے لندن کی گول میز کانفرنس کے اجلاسوں میں ہند کے فرقہ وارانہ مسائل کو حل کرنے کے لیے دونوں فرقوں کے رہنما سر جوڑ کر غور و فکر میں مصروف تھے لیکن ہندو رہنماؤں کی ہٹ دھرمی کے باعث کوئی قابل قبول تصفیہ نہ ہو سکا بالآخر ۱۹۳۲ء میں وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ نے وہ اعلان کیا جو تاریخ میں کمیونل ایوارڈ کے نام سے مشہور ہے اس ایوارڈ کے تحت مسلمانوں کو مختلف صوبائی مجالس قانون ساز میں جداگانہ نیابت کی بنیاد پر نشستیں دی گئی تھی ہندوؤں نے اس ایوارڈ کی مخالفت کی لیکن مسلمانوں نے اسے خاموشی سے تسلیم کر لیا۔ آخر کار برطانیہ کو ۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نافذ کرنا پڑا جس کے تحت ۱۹۳۷ء میں انتخاب ہوئے جس کے نتیجے میں ہند کے گیارہ میں سے سات صوبوں میں کانگریس وزارت بنانے میں کامیاب ہو گئی اور جن صوبوں میں مسلمان اکثریت سے آئے تھے وہاں کانگریس نے مسلمانوں میں تفرقہ ڈال کر ایسی صورت پیدا کر دی کہ کاروبارِ حکومت کی باگ ڈور یا تو ہندؤں کے ہاتھ میں آ گئی یا ایسے لوگوں کے ہاتھ میں جو ہندوؤں کے نیاز مند تھے ان حربوں سے کانگریس کو آسام اور سندھ میں کامیابی حاصل ہو گئی خیال کیا جا رہا تھا کہ اقلیتی صوبوں میں کانگریس مسلمانوں کے اشتراک سے وزارتیں بنائے گی لیکن کانگریس نے مسلمانوں کو نظر انداز کر دیا اور انہیں مساوی مواقع دینے

"مسلمانوں کو چار مسلم ریاستیں (پٹھان صوبہ مغربی پنجاب سندھ اور مشرقی بنگال) ملتی تھیں اس نے کہا تھا کہ ہندوستان کی وحدت ناممکن ہے اس لیے ملک کو تقسیم کر دینا ہی بہتر ہے۔"

یہ تمام تجاویز منتشر خیالات کی شکل میں تھیں علامہ اقبالؒ نے ان تجاویز کو ایک مدلل اور منضبط فارمولے کی شکل میں پہلی بار پیش کیا اور علامہ کی تجویز جنوبی ایشیا میں بسنے والے مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئی۔

چوہدری رحمت علی: ۱۹۳۰ء میں پنجاب کے ایک نوجوان چوہدری رحمت علی کیمبرج یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ وہ بھی انہی خطوط پر سرگرم عمل تھے۔ ۱۹۳۳ء میں انہوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا جس کا نام تھا "اب یا کبھی نہیں"، اس میں یہ بتلایا گیا تھا کہ ہندوستانی قومیت کا تصور انگریزوں کی اختراع ہے۔ اس ملک میں متعدد قومیں بستی ہیں۔ چوہدری صاحب نے اس مملکت کا نام پاکستان قرار دیا اور اس کی وضاحت یوں کی کہ:

"اس میں پ سے مراد پنجاب ا سے افغان صوبہ (صوبہ سرحد) ک سے کشمیر س سے سندھ اور تان سے بلوچستان ہے۔"

آگے چل کر چوہدری صاحب نے اپنے منصوبے کو اور بھی وسعت دی جس میں بنگال آسام اور ریاست حیدر آباد (دکن) کی علیحٰدہ ریاستوں کا تصور پیش کیا گیا تھا۔

"اگر ہندو اور مسلمان دو اچھے اور پر امن پڑوسیوں کی طرح زندگی
بسر کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو پھر ہندوستان کو ہندو
صوبوں اور مسلم صوبوں میں تقسیم کر دینا ہی بہتر ہو گا۔"

اپریل ۱۹۲۰ء میں محمد عبد القدیر بلگرامی کا ایک کھلا خط گاندھی کے نام اردو رسالے "ذوالقرنین" میں شائع ہوا تھا اس میں تجویز پیش کی گئی تھی کہ ہندوستان کو قومی بنیادوں پر تقسیم کر دیا جائے اور اس سلسلے میں ان اضلاع کی نشاندھی بھی کر دی گئی تھی جو تقسیم کی صورت میں مسلم مملکت میں شامل ہو سکتے تھے۔

۱۹۲۳ء میں ڈیرہ اسماعیل خاں کے ایک سیاسی رہنما سردار گل خاں نے صوبہ سرحد کے متعلق ایک تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے ہندوستان کی مذہبی بنیادوں پر تقسیم کی سفارش کی تھی۔

۱۹۲۴ء میں مولانا حسرت موہانی نے آزادی ہند کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا اور اس سلسلے میں انہوں نے مختلف ہندو رہنماؤں سے تبادلہ خیال بھی کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ :

"مستقبل کے آزاد ہندوستان کا قیام دو قومی بنیاد پر ہو مسلم
اکثریتی صوبے مسلم ریاست بنیں اور پھر ان کا مرکزی وفاق قائم
کیا جائے جس کا انتظام و انصرام ہندوؤں اور مسلمانوں کے
نمایندے مشترکہ طور پر کریں۔"

اسی سال مہا سبھائی لیڈر لالہ لاجپت رائے نے بھی ایک منصوبہ پیش کیا تھا جس کی رو سے ——

ایک نسل کی طرح کے جذبات اور سوچ کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ خود ہندو ایک قوم نہیں ہیں ان حالات میں ہندوستان کے اندر مغربی انداز جمہوریت کیسے ممکن ہو سکتا ہے اس لیے آج مسلمان یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے اندر ہی ایک اسلامی ہندوستان کا قیام عمل میں لایا جائے...... جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں کچھ اور آگے جانا چاہتا ہوں میں تو چاہتا ہوں کہ پنجاب صوبہ شمال مغربی سرحد۔ سندھ اور بلوچستان کو ایک ریاست کی صورت دے دی جائے چاہے پھر یہ ریاست برطانوی ہند ہی کے اندر اپنی خود مختار حکومت کا قیام عمل میں لائے یا اس سے باہر مگر میرا احساس ہے کہ آخر کار شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک علیحدہ اسلامی ریاست لازماً قائم کرنا پڑے گی...... ہندوستان میں مسلمان دنیا بھر کے مقابلے میں اکثریت میں ہیں لہٰذا ہماری خواہش ہے کہ اسلام کو ایک تمدنی طاقت بن کر زندہ رہے اور اس مقصد کے لیے اسے مرکزیت قائم کرنا ہو گی۔"

در اصل علامہ اقبالؒ کا یہ خیال بنفسہ نیا نہیں تھا ان سے پہلے بہت سے مسلم زعماء اس خیال کا اظہار کر چکے تھے۔ اخبار مہذّب کے ایڈیٹر مولانا عبدالحلیم شرر نے ہندو مسلم فسادات سے متاثر ہو کر اپنے اخبار کی ۱۳ اگست ۱۸۹۰ء کی اشاعت میں یہ لکھا تھا کہ:

اور کس طرح یہاں کی اکثریت نے خوف و ہراس میں مبتلا کر کے مسلمانوں کو ان کے دین و مذہب اور تمدّن و ثقافت سے الگ کرنے کی کوشش کی علامہؒ نے فرمایا:

"ہند کے لوگوں کا ایک حصّہ ایسا بھی ہے جو اپنی تہذیب و تمدّن میں اقوامِ مشرق سے خاصی مشابہت رکھتا ہے مگر ایک دوسرا حصّہ ایسا بھی ہے جو مغربی یا وسطی ایشیا میں آباد اقوام سے مشابہ ہے چنانچہ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر ہندوستان ہی میں باہمی اشتراک کی کوئی صورت پیدا ہو جائے تو ہندوستان میں کسی بنیادی قباحت کی وجہ سے نہیں بلکہ جغرافیائی اعتبار سے جو باشندے تختۂ مشق بنتے چلے آ رہے ہیں ان میں صلح ہو جائے گی بلکہ پورے ایشیا کی گتھی سلجھ جائے گی مگر افسوس کہ اس ضمن میں ہم نے اب تک جو مساعی کی ہیں وہ بار آور نہ ہو سکیں۔"

آگے چل کر علامہؒ نے فرمایا:

"اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں ہم آہنگ قوم کی نشوونما کی مانند مختلف ملتوں کا وجود ضروری ہے۔ مغربی ملکوں اور ہندوستان میں ایک فرق ہے وہاں کی طرح یہاں صرف ایک قوم کے آباد رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لیے کہ یہاں مختلف زبانیں ہیں۔ یہاں مختلف نسلیں ہیں مختلف مذاہب ہیں ان کے فعل یکساں کیسے ہو سکتے ہیں؟ ان میں

عاری ہو آپس میں مل جل کر رہنے کے لیے کم از کم جو مطالبے کئے جا سکتے تھے۔
وہ قائد اعظمؒ نے ان نکات میں پیش کئے تھے۔ اگر واقعتہً ہندو رہنماؤں کے
دل صاف ہوتے اور وہ معمولی سی رواداری اور فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے تو
شاید ہندو مسلم اتحاد کی کوئی اچھی صورت نکل آتی۔ لیکن یہاں تو نیتیں فاسد اور
ارادے ہی دوسرے تھے، یہاں تو رام راج اور ہندو راج کا خواب دیکھا
جا رہا تھا اس لئے ہندوؤں نے نہایت شدت سے ان چودہ نکات
کی مخالفت شروع کر دی۔ قائد اعظمؒ نے چونکہ ان چودہ نکات کے ذریعہ
مسلمانوں کو ایک ملّی شعور بخشا تھا اس لئے جنوبی ایشیا کے مسلمان ان
نکات پر اڑ گئے، ہندوستان کے سیاسی مسائل کو طے کرنے کے لئے
لندن میں گول میز کانفرنس ہوئی لیکن ہندو رہنماؤں کی بے جا ہٹ دھرمی کے
باعث کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا اسی کانفرنس کے دوران مولانا محمد علیؒ جوہر کا انگلستان
ہی میں انتقال ہو گیا۔

مسلم لیگ کا اجلاس الہ آباد

۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو الہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس زیر
صدارت شاعر مشرق علامہ اقبالؒ منعقد ہوا علامہ موصوف نے اپنے طویل
خطبۂ صدارت میں تفصیل کے ساتھ ان حالات کا تجزیہ کیا جن سے مسلمانوں
کو برطانوی دور میں دوچار ہونا پڑا اور بتلایا کہ کن کن مواقع پر مسلمانوں نے کوشش
کی کہ ہندوستان کی اکثریت سے برادرانہ اور مخلصانہ روابط قائم کئے جائیں

۷۔ تمام قوموں کو پوری مذہبی آزادی حاصل ہو۔

۸۔ اگر کسی مجلس قانون ساز میں کوئی ایسا قانون یا ایسی قرارداد پیش ہو جس سے کسی ایک قوم پر کوئی بُرا اثر پڑتا ہو، اس کی منظوری کے لئے ضروری ہو کہ اس قوم کے ارکان کی تین چوتھائی اکثریت اتفاق کرے۔

۹۔ سندھ کے علاقے کو صوبہ بمبئی سے الگ کر کے ایک الگ صوبے کی حیثیت دی جائے۔

۱۰۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں دوسرے صوبوں کے برابر آئینی اصلاحات نافذ کی جائیں۔

۱۱۔ اسلامی ثقافت، تعلیم، زبان، مذہب، شخصی قوانین اور مسلمانوں کے مخیر اداروں کی حفاظت کے لیے آئین میں مناسب ضمانت دی جائے۔

۱۲۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو مناسب حصّہ دیا جائے۔

۱۳۔ کوئی ایسی مرکزی یا صوبائی وزارت نہ بنائی جائے جس میں مسلمان وزیروں کی تعداد کم از کم ایک تہائی نہ ہو۔

۱۴۔ صوبوں کی رضامندی کے بغیر آئین میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔

مذکورہ بالا چودہ نکات پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے ہی سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان نکات میں سوائے اس کے کہ مسلمانوں کے تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے ان کے دینی، سماجی، معاشی اور معاشرتی حقوق کے تحفظ کا مطالبہ کیا گیا تھا اور کوئی دوسرا مقصد نہ تھا ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں اور غالب اکثریت رواداری کے جذبات سے قطعاً

مگر قائد اعظم کی ان مخلصانہ کوششوں اور موثر بیانات کا ہندو ذہن پر کوئی بھی اثر مترتب نہیں ہوا اور وہ بدستور جنوبی ایشیا میں اپنا تسلط قائم کرنے اور مسلمانوں کو غلام بنا کر رکھنے کے خواب دیکھتے رہے ناچار ایک آخری کوشش کے طور پر مارچ ۱۹۲۹ئہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی میں قائد اعظم نے وہ چودہ نکات پیش کئے جن سے جنوبی ایشیا کے سارے مسلم رہنماؤں نے اتفاق کیا۔

وہ چودہ نکات یہ ہیں :

۱۔ وفاقی نظام حکومت قائم کیا جائے اور اس میں صوبوں کے اختیارات کا خاص خیال رکھا جائے۔

۲۔ تمام صوبوں کو اندرونی معاملات میں ایک دوسرے کے برابر خود مختاری حاصل ہو۔

۳۔ تمام قانون ساز مجالس میں اقلیتوں کو مناسب اور مؤثر نمائندگی دی جائے لیکن شرط یہ ہے کہ اس سے کسی صوبے کی اکثریت نہ اقلیت میں بدلے نہ ان سے برابری میں، گویا اکثریت ہر حال میں باقی رہے۔

۴۔ مرکزی قانون ساز اسمبلی میں ایک تہائی ارکان مسلمان ہوں۔

۵۔ سب قوموں کو جداگانہ انتخاب کا حق دیا جائے۔ اور ایسی گنجائش رکھی جائے کہ اگر کوئی قوم اسے چھوڑ کر مخلوط انتخاب چاہے تو حاصل کر سکے۔

۶۔ صوبوں کی حدود میں کوئی تبدیلی ہو تو اس سے پنجاب، بنگال اور صوبہ سرحد کی مسلم اکثریت پر کوئی بُرا اثر نہ پڑے۔

(الف) مسلمانوں کو اسلام سے الگ کر کے ان کے پرانے دہرم پر واپس لایا جائے۔

(ب) اگر یہ ممکن نہ ہو تو مسلمانوں کو ان کے اپنے قدیم علاقے میں واپس بھیج دیا جائے۔

(ج) اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو ان لوگوں کو ہندوستان میں رعایا بنا کر رکھا جائے۔"

گاندھی کی ان غیر ذمہ دارانہ اور متعصبانہ باتوں کے باوجود قائداعظمؒ نے ہمت نہ ہاری اور آخر تک ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوشاں رہے۔ دہلی کے اجلاس میں انھوں نے ارشاد فرمایا:

"مسلمانوں کے بارے میں کانگریس کا رویہ اب تک غیر یقینی ہے کیونکہ اس لمحے تک کوئی ذمہ دار کانگریسی یا ہندو رہنما کسی ٹھوس تجاویز کے ساتھ سامنے نہیں آیا اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں سوچنا ہی مناسب نہیں سمجھا۔ ملک کے اندر فرقہ واریت بدستور موجود ہے ...... ہماری خواہش تو صرف اتنی ہے کہ ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں میں مفاہمت ہو جائے اور اختلافات ختم ہو جائیں تو ایک ذمہ دار اور خود مختار حکومت کے قیام کے سلسلے میں ہمارا نصف سفر طے ہو جائے۔"

مرکز میں ہوگا۔

۲۔ جداگانہ طریق انتخاب ختم کر دیا جائے کیونکہ کمیٹی کی رائے میں یہ طریقہ قومی ارتقاء کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔

۳۔ قائد اعظم کی دہلی تجاویز کے مطابق نشستوں کے تحفظ کا اصول رد کر دیا گیا۔

۴۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ ایک چوتھائی نشستیں دی جا سکتی ہیں۔

۵۔ صوبہ سرحد اور سندھ کو مکمل صوبوں کی حیثیت دی جائے۔

۶۔ جنوبی ہند میں ایک نئے ہندو صوبے کا قیام عمل میں لایا جائے۔

۷۔ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کو تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔

۸۔ ہندوستان کی سرکاری زبان ہندی قرار دی جائے۔

ان نکات پر غور کرنے سے بہ آسانی ہندو ذہنیت سمجھ میں آجاتی ہے اور اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ جنوبی ایشیا کے ہندو کسی صورت میں بھی اس بات کو برداشت کرنے کے تیار نہیں تھے کہ یہاں مسلم عوام کا کسی قسم کا مذہبی یا سیاسی تشخص قائم ہو۔ گاندھی نے اپنے اخبار "ینگ انڈیا" میں ایک مضمون لکھا اور انہوں نے جنوبی ایشیا کے فرقہ وارانہ مسئلے کا یہ حل تجویز کیا کہ:

"مسلمان یا تو عرب حملہ آوروں کی اولاد ہیں یا وہ لوگ ہیں جو ہم میں سے تھے اور اب ہم سے الگ ہو چکے ہیں اگر ہمیں اپنا وقار قائم رکھنا ہے تو ہمیں صرف تین طریقے تلاش کرنے پڑیں گے:

ہو سکی اگرچہ جناب قائد اعظمؒ دل و جان سے اس بات کے لیے کوشاں تھے بالآخر مرکزی اسمبلی کے بجٹ اجلاس کے دوران ۱۹۲۷ء میں دہلی میں قائد اعظم کی صدارت میں ایک اجلاس ہوا جس میں قائد نے طویل غور و فکر کے بعد فرقہ وارانہ مسائل کو حل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کیں۔

۱۔ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک جدا صوبہ بنا دیا جائے

۲۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اسی سطح اور معیار کی اصلاحات نافذ کی جائیں جیسی دوسرے صوبوں میں ہیں۔

۳۔ بنگال اور پنجاب میں نیابت کا تناسب آبادی کے تناسب کے مطابق ہو مرکزی مجلس واضعان قانون میں مسلمانوں کی نیابت ایک تہائی سے کم نہ ہو۔

۴۔ اس صورت میں مسلمان اس بات کے لیے تیار ہیں کہ وہ مخلوط انتخابات منظور کر لیں۔

قائد اعظم نے یہ تجاویز ایک یادداشت کی صورت میں مرتب کروا کر ۱۲۸ اراکین سے اس پر دستخط کروائے اور گاندھی کے پاس بھیج دیں لیکن پنڈت مدن موہن مالوی نے انہیں مسترد کر دیا اور اس کے فوراً بعد ملک کے طول و عرض میں ہندوؤں نے بلوے شروع کر دیئے قائد اعظم کی دہلی تجاویز کے مقابلے میں موتی لال نہرو نے ایک رپورٹ پیش کی جس کے خاص خاص نکات یہ تھے:

۱۔ ہندوستان کا طرز حکومت وحدانی ہوگا اور تمام اختیارات کا ارتکاز

کا سلسلہ چل نکلا جن میں سینکڑوں افراد ہلاک اور ہزاروں زخمی ہوئے ۔ ان بلوؤں میں اکثر مسلمانوں ہی کو نقصان اٹھانا پڑتا ان حالات سے مسلم رہنما سخت پریشان تھے ان کی پرخلوص خواہش یہی تھی کہ جس طرح بھی ہو فسادات بند ہونے چاہئیں لیکن اس سلسلے میں ہندو لیڈروں کا رویّہ نہایت افسوسناک تھا فرقہ پرست لیڈر تو خیر فرقہ پرست تھے ہی گاندھی جو خود کو اہنسا (عدم تشدد) کا پرچارک وامن کا مبلغ کہتا تھا۔ خاموش تماشائی بن بیٹھا البتہ ایک مرتبہ اس نے کلکتہ میں ایک معنی خیز جملہ کہا کہ:

"اگر ہمارا مقدر یہی ہے کہ اس اتحاد سے پہلے ایک دوسرے
کا خون بہائیں تو میں کہتا ہوں کہ یہ کام جس قدر جلد ہو جائے اچھا ہے"

اس کا مطلب یہی ہوا کہ فسادات ہوتے رہیں اور مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہتا رہے ۔ لیکن انہیں ایام میں ۱۹۲۴ء کے ستمبر میں کوہاٹ میں ایک فرقہ وارانہ فساد ہوا ۔ چونکہ اس علاقے میں ہندو اقلیت میں تھے اس لیے لامحالہ ہندوؤں کو زیادہ نقصان پہنچا اور تقریباً ایک سو پچاس ہندو ہلاک ہو گئے ۔ سینکڑوں زخمی اور ہزاروں ترک وطن کر کے راولپنڈی چلے آئے اس خبر کو ہندو پریس نے خوب اچھالا ۔ گاندھی جی تڑپ اٹھے انہوں نے فوراً اکیس دنوں کے برت کا اعلان کر دیا ۔ جلد ہی گاندھی کے برت نے کل ہند مسئلے کی شکل اختیار کر لی اور ہندوستان بھر کی سیاسی جماعتوں نے اتحاد کانفرنس بلانے کا فیصلہ کیا اور ۲۱ نومبر ۱۹۲۴ء کو بمبئی میں تمام سیاسی جماعتوں کو ایک اتحاد کانفرنس میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی لیکن ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہ

کیا تو ہندؤوں کا مستقبل تاریک ہو کر رہ جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کو صرف اس صورت میں ہندوستان میں رہنے کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ وہ ہندوانی نام اختیار کریں، ہندؤوں کی مذہبی تقاریب میں شرکت کریں۔ ہندؤوں کے بزرگوں کے ترانے گائیں۔ ہندؤوں جیسا لباس پہنیں ان کی رسومات کو اپنائیں اور خود کو مسلمان کہلانا چھوڑ دیں البتہ اگر وہ اس کے بعد بھی اپنے مذہبی عقائد پر قائم رہنا چاہیں تو انہیں اپنے طریق پر عبادت کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے لیکن انہیں محمدی ہندو کہلانا ہو گا۔"

شدھی تحریک کے ساتھ ساتھ سنگٹھن تحریک بھی چلنے لگی۔ اس کا بانی ڈاکٹر مونجے تھا، اس نے اس بات پر زیادہ زور دیا کہ ہندؤوں کو فن سپہ گری سیکھنا چاہیئے تاکہ بزور شمشیر مسلمانوں کو ہندو مت قبول کرنے پر مجبور کیا جاسکے۔ بات یہیں تک ختم نہ ہوئی بلکہ ہندؤوں نے کھلم کھلا مسلمانوں کی عبادت میں دخل اندازی شروع کر دی۔ ہندوستان میں صدیوں سے یہ رواج چلا آرہا تھا کہ کسی تقریب کے موقع پر جب کوئی جلوس مسجد سے گزرتا تو باجے بند کر دئے جاتے تاکہ نمازیوں کی نمازیں خلل نہ واقع ہو لیکن اب بالارادہ مسلمانوں کی مساجد کے سامنے باجے بجائے جاتے، عین نماز کے وقت مندروں میں گھنٹے بجنے لگتے اور سنکھ پھونکے جاتے۔ اگر کوئی مسلمان اعتراض کرتا تو فساد شروع ہو جاتا ہے اس طرح تقریباً ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں بلوؤں

پاکستان کو اپنا نصب العین قرار دیا اور اس کے لئے جدوجہد شروع

فرقہ وارانہ فسادات و تحریکات

مسلمان ابھی تحریک خلافت کے جانکاہ صدمے سے پوری طرح سنبھ
بھی نہ پلٹے تھے کہ برصغیر میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوگئے جس نے
دیکھتے ہی دیکھتے ملک گیر صورت اختیار کرلی اور جا بجا مسلمانوں کی جان و ما
پر حملے شروع ہوگئے۔ مسلمانوں کو قتل اور ان کی املاک کو تباہ کیا جاتا رہا ا
گاندھی جی اپنے آشرم میں گوشہ نشین ہوکر چرخا کاتنے میں مصروف رہے
انگریزوں نے سوامی شردھانند کو رہا کردیا اور وہی شردھانند جسے مسلمانو
اپنے کاندھوں پر اٹھاکر جامع مسجد دہلی میں لائے تھے آگ اگلنے لگ
اور اس نے شدھی کا نعرہ لگایا۔ اس کے نعرے کی منطق یہ تھی کہ:

"ہندوستان میں جتنے بھی مسلمان ہیں وہ ہندوؤں کی اولاد ہیں لہٰذا ہندوؤں کا یہ مقدس فرض ہے کہ ان مسلمانوں کو ہندو بنا دیا جائے۔"

ادھر ہندو مہاسبھا کے سربراہ پنڈت مدن موہن مالویہ اور لالہ ہردیا
نے کہنا شروع کردیا کہ:

"اگر ہندوؤں نے فوجی تربیت حاصل نہ کی اور ہندوستان میں ہندو راج قائم نہ کیا، مسلمانوں کو ہندو نہ بنایا اور افغانستان اور سرحد کو فتح کرکے وہاں کے عوام کو ہندو مت میں شامل نہ

نہیں تھا تشدد کی ابتداء تو پولیس ہی کی طرف سے کی گئی تھی۔ مگر گاندھی نے
ں واقعے کو بہانہ بنا کر تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون کے خاتمے کا
علان کر دیا۔ گاندھی کے اس اقدام کا مسلمانوں پر شدید ردعمل ہوا اور ان کا یہ
حساس تھا کہ عین اس وقت جبکہ وہ فتح و کامرانی سے ہم کنار ہونے والے
تھے ان سے غداری کی گئی۔ ادھر اتاترک مصطفیٰ کمال نے خلافت کے خاتمے
ا اعلان کر دیا۔ اس طرح پچھلے کئی برسوں سے مسلمانوں نے جو عظیم قربانیاں پیش
ی تھیں سب کی سب اکارت چلی گئیں انہیں ایسا لگا جیسے کہ وہ اڑتے چلے
ا رہے تھے کہ یکدم دھڑام سے زمین پر گر پڑے ہوں۔

ناکامی کا روشن پہلو

گو کہ تحریک خلافت ناکام ہوگئی تاہم اس تحریک نے دو باتیں واضح کر دیں۔

۱۔ ایک تو یہ کہ مسلمانوں نے ایک زندہ قوم کی حیثیت سے اپنے ملی تشخص کو منوا لیا اور ہندوؤں اور انگریزوں کو علم ہو گیا کہ مسلمان قوم اپنے مقصد کے حصول کے لیے قربانیاں دینا جانتی ہے۔

۲۔ دوسری یہ کہ اب مسلمانوں پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ جنوبی ایشیا میں اپنے مستقبل کی تعمیر انہیں خود کرنا ہو گی اور اگر وہ متحد ہو کر کسی بلند نصب العین کے حصول کے لیے میدان عمل میں اتریں گے تو بے شمار موانع اور دشواریوں کے باوجود وہ اپنی منزل کو پا لینے میں کامیاب ہوں گے ان کا یہی احساس اس وقت رنگ لایا جب انہوں نے

ختم نہیں ہوئیں ہندو سمجھتے ہیں کہ ہندوستان سے انگریز چلا گیا
تو مسلمان بعض دیگر طاقتوں کے ذریعے ہندوستان میں اسلامی
حکومت قائم کرلیں گے۔"

جلد ہی گاندھی کو یہ احساس ہوگیا کہ تحریک خلافت کو سوراج کے ساتھ نتھی کرکے اس نے ایک بنیادی غلطی کی ہے کیونکہ اس کے اور مسلمان رہنماؤں کے خیالات میں ہم آہنگی نہیں پائی جاتی تھی۔ مسلمانوں کی فطرت ہے کہ وہ دوستی یا دشمنی کھلے دل سے کرتے ہیں۔ جب ہندو لیڈروں نے خود ہی آگے بڑھ کر تحریک خلافت میں حصہ لینا شروع کیا تو مسلمانوں نے اپنی فطرت کے مطابق کھلے دل سے ان کا خیر مقدم کیا اور وہ اس معاملے میں اس قدر جذباتی ہو گئے کہ سوامی شردھانند جیسے متعصب ہندو کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر دہلی کی جامع مسجد میں لے گئے اور اسے مکبّر کے منبر پر بیٹھ کر تقریر کرنے کی سعادت بخشی لیکن اس ساری وفاکشی اور خلوص و صداقت کا نتیجہ یہ نکلا کہ عین اس وقت جبکہ تحریک خلافت اپنے شباب پر تھی، لاتعداد ہندو اور مسلمان رہنما جیلوں میں ٹھونسے جا چکے تھے فروری ۱۹۲۲ء میں گورکھپور کے ایک قصبے چوراچوری میں عوام اور پولیس میں زبردست تصادم ہوگیا پولیس نے فائرنگ کی اور جب اس کی گولیاں ختم ہوگئیں تو تھانے کی عمارت میں پناہ لے لی اور ہجوم کے خوف سے دروازے بند کرلیے برہم عوام نے تھانے میں آگ لگا دی جس کے نتیجے میں پولیس کے ۱۲۲ افراد زندہ جل مرے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تشدد کا ایک سنگین واقعہ تھا۔ لیکن تشدد یک طرفہ

کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے۔ اہل وطن سرکاری ملازمتوں سے دستبردار ہو جائیں خطابات واپس کر دیں عدالتوں میں نہ جائیں حکومت کے کالجوں اور یونیورسیٹوں کو چھوڑ دیں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور گاندھی تحریک خلافت اور سوراج کے سلسلے میں ملک میں طوفانی دورے کرنے لگے اور عدم تعاون کی تحریک کو کچلنے کے لیے برطانیہ نے گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ دسمبر ۱۹۲۱ء اور جنوری ۱۹۲۲ء کے دوران کم و پیش تیس ہزار ہندو مسلمان رضاکاروں نے گرفتاری پیش کی۔ بظاہر اتحاد کا اعلیٰ مظاہرہ ہو رہا تھا لیکن در حقیقت اس اتحاد میں تصنع تھا۔ کیونکہ گاندھی یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ انگریز ہندوستان سے چلے جائیں اور ہندوستان کو مکمل آزادی مل جائے ان کی تو خواہش تھی کہ تاج برطانیہ کے تحت ہندوستان کی اکثریت (یعنی ہندوؤں) کو حکومت کرنے کا حق مل جائے یہی وجہ تھی کہ جب مولانا حسرت موہانی نے کانگریس کے اجلاس میں مکمل آزادی کی تجویز پیش کی تو گاندھی سخت برہم ہوئے اور کہا۔

"ہمیں سب سے پہلے اپنی طاقت کو مجتمع کرنا چاہیے، ہمیں اس پانی میں نہیں اترنا چاہیے جس کی گہرائی سے ہم واقف نہیں ہیں اور مولانا حسرت موہانی کی یہ تجویز آپ کو اس گہرائی میں لیے جا رہی ہے جس کی پیمائش نہیں ہو سکتی۔"

مئی ۱۹۲۱ء میں گاندھی نے اپنے اخبار میں اپنے دل کی بات کہدی "اب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں سے بدگمانیاں

جب آل انڈیا مسلم کانگرنس کا اجلاس ہوا تو اس میں کل ہند خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ۲۳ ر نومبر ۱۹۱۹ء کو اس کمیٹی کا پہلا اجلاس "خلافت کانفرنس" کے نام سے شیرِ بنگال مولوی فضل حق کی صدارت میں دہلی میں منعقد ہوا۔ اس کانفرنس میں پنڈت موتی لال نہرو۔ پنڈت مدن موہن مالوی اور گاندھی بھی شریک ہوئے۔ چند ہی دنوں بعد دہلی میں علماء کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں جمعیتہ العلماء ہند کا قیام عمل میں آیا اور مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے خلافت اور مسلمانوں کے مقدس مقامات کے تحفظ کے وعدے سے پھر جانے پر حکومت برطانیہ کے خلاف محاذ آرائی شروع کی۔ چونکہ خلافت اور مقامات مقدسہ دونوں مسائل کا تعلق مسلمانوں کے جذبات سے تھا اس لیے بہت جلد مسلمانان ہند کے اضطراب نے دہکتے ہوئے انگارے اور شعلہ جوالہ کی صورت اختیار کرلی۔ اس ہیجان کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ برطانوی پالیسی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے لاتعداد مسلمان افغانستان کی طرف ہجرت کر گئے؟ گاندھی نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے اس ہیجان و اضطراب سے فائدہ اٹھائے اور اس نے مسلمانوں کی اس بے چینی کو سوراج کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ تحریک خلافت میں مسلمان کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں گاندھی کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کے پیشِ نظر تو صرف یہ بات تھی کہ مسلمانوں کی اس ہیجانی کیفیت سے فائدہ اٹھا کر اسے سوراج کے لیے استعمال کیا جائے۔ چنانچہ منصوبہ یہ بنایا گیا کہ برطانوی اداروں اور مصنوعات

میثاق لکھنؤ قائد اعظم محمد علی جناح کی زندگی کا نہ صرف یہ کہ بہت بڑا کارنامہ تھا بلکہ اس معاہدے کی بنا پر مسلم لیگ کو قدم آگے بڑھانے اور جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کے قومی و ملی تشخص کو تسلیم کرانے کے مواقع بھی نصیب ہو گئے۔

تحریکِ خلافت

۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو ترکی نے جرمنی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ مسلمانان ہند کی خواہش تھی کہ ترکی کی خلافت عثمانیہ برقرار رہے اور مسلمانوں کے مقامات مقدسہ کی حفاظت کی جائے۔ انگریز حکمرانوں نے مسلمانوں کو بار بار اس بات کا یقین دلایا کہ اختتام جنگ کے بعد وہ خلافت کو بحال کر دیں گے اور مقامات مقدسہ کی بھی حفاظت کریں گے۔ حکومت برطانیہ کی یقین دہانی پر اعتماد کر کے مسلمانوں نے کسی قدر برطانیہ سے تعاون کیا لیکن جب ۱۹۲۰ء میں جنگ عظیم انگریزوں کی فتح پر منتج ہوئی تو وہ اپنے سابقہ وعدوں سے پھر گئے۔ یونان۔ فرانس اور برطانیہ نے جنگ کے دوران ہی ترکی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا خفیہ معاہدہ کر رکھا تھا چنانچہ جنگ کے خاتمے پر ان تینوں طاقتوں نے ترکی کا بٹوارہ شروع کر دیا۔ حکومت برطانیہ کے مکروہ عزائم کو بھانپ کر ۱۹۱۹ء میں بمبئی میں مسلمانوں نے ایک خلافت کمیٹی قائم کر لی تھی۔

برطانیہ کی اس بد عہدی کو دیکھ کر مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے یہ فیصلہ کیا کہ خلافت کمیٹی کو ملک گیر تنظیم بنایا جائے چنانچہ اسی سال لکھنؤ میں

میثاق لکھنؤ

جنوبی ایشیا کی تاریخ میں میثاق لکھنو خصوصی اہمیت کا حامل ہے مسلمانان ہند کے سیاسی سفر میں اس میثاق کو ایک موثر کی حیثیت حاصل ہے ۲۱ر دسمبر ۱۹۱۶ء کو لکھنؤ میں مسلم لیگ کا ایک اجلاس قائد اعظم محمد علیؒ جناح کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں میثاق لکھنؤ منظور کیا گیا جس کے تحت یہ قرار پایا کہ:

۱۔ ہر بڑے صوبے کی مجلس قانون ساز کے ارکان کی تعداد سو سے ایک سو پچاس تک ہو گی اور چھوٹے صوبوں میں یہ تعداد پچاس سے پچھتر تک محدود ہو گی اور مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں یہ بات قرار پائی کہ ان کی نشستیں محفوظ ہوں گی۔

۲۔ اس میثاق کی رو سے پنجاب میں مسلمانوں کے لیے پچاس فیصد بنگال میں چالیس فیصد بہار میں بیس فیصد سی پی میں پندرہ فیصد مدراس میں پندرہ فیصد اور بمبئی میں تیئس فیصد نشستیں محفوظ کر دی گئیں۔

بظاہر یہ میثاق مسلمانوں کے لئے نقصان دہ نظر آرہا تھا کیونکہ مسلم اکثریت کے علاقوں میں ان کی نشستیں کم ہو گئی تھیں لیکن اس سے دو اہم فائدے حاصل ہوئے:

الف: ایک تو یہ کہ اقلیتی صوبوں میں آبادی کے تناسب کے اعتبار سے مسلمانوں کو زیادہ نشستیں ملیں۔

ب: دوسرے یہ کہ کانگریس نے مسلمانوں کا جداگانہ حق نیابت تسلیم کر لیا۔

عقیدت مند تھے۔ اوران کا خیال تھا کہ جب تک ہندوستان کی دو بڑی قومیں (ہندو اور مسلمان) متحد نہ ہوں گی اس وقت تک یہاں کے لوگ اپنے سیاسی حقوق حاصل نہ کرسکیں گے۔ ۱۹۰۶ء تک انہوں نے وکالت کے پیشے میں اپنا مقام پیدا کرلیا تھا اور وہ عملی سیاست میں حصّہ لینے لگے تھے۔ شروع شروع میں وہ "انڈین نیشنل کانگرس" کی طرف رجوع ہوئے اور اپنی بیشتر صلاحیتیں ہندو مسلم اتحاد کے جذبے کو پروان چڑھانے میں صرف کیں۔ لیکن ۱۹۱۳ء میں انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیّت اختیار کرلی۔ اسی سال انہوں نے مسلم اوقاف کو قانونی حیثیّت دینے کے لیے مرکزی مجلس ساز میں ایک بل پیش کیا اور اپنی قوتِ استدلال اور قانونی قابلیّت کے ذریعہ اس بل کو منظور کروا لینے میں کامیاب ہو گئے۔

مسلم لیگ کے بانیوں کا ابتداء میں یہ خیال تھا کہ مسلم لیگ کانگرس کی حریف جماعت ہو گی لیکن محمد علی جناح نے مسلم لیگ میں شریک ہوتے ہی اس نقطہ نظر کو بدل دیا۔ وہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر مسلم لیگ سے وابستہ رہے لیکن انہوں نے کانگریس سے بھی ناطہ نہ توڑا اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کانگریس کی خوبیاں بلا جھجک بیان کرتے اور اسی طرح کانگریس کے پنڈال میں مسلم لیگ کی اہمیت واضح کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح باہمی رواداری کی ایک فضا پیدا ہو گی اور کانگریسی لیڈروں کے دل مسلم لیگ سے صاف ہو جائیں گے۔

کارروائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، اور برطانوی حکومت نے ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دئے اور ۱۹۱۱ء میں تنظیم نو منسوخ کر دی گئی۔ اس طرح مشرقی پاکستان کے ستم رسیدہ اور کچلے ہوئے کاشتکار دوبارہ ہندوؤں کی غلامی میں چلے گئے۔

بنگال کی تقسیم نو کی تنسیخ نے جنوبی ایشیا کے مسلم عوام اور دانشوروں پر دو حقیقتیں واضح کر دیں:

۱۔ ایک تو یہ کہ چاہے ہندوؤں کے ساتھ لاکھ تعاون کیا جائے اور چاہے ہندو رہنما کتنے ہی بلند بانگ دعوے کیوں نہ کریں سرسید کے بقول ان کے دل کا عناد اور مسلمانوں کو غلام بنا کر رکھنے کی خواہش کبھی بھی ختم نہ ہو گی۔

۲۔ اور دوسری یہ کہ انگریزوں پر اپنے حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں بھروسہ کرنا بے سود ہے۔ اگر جنوبی ایشیا کے مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ وہ اس علاقے میں عزت کی زندگی گذاریں اور اپنی ملی روایات کے مطابق کاروبارِ حیات چلائیں تو انہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا اور اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لئے خود ہی جدوجہد کرنا ہو گی۔

قائداعظمؒ کی لندن سے واپسی

۱۸۹۶ء میں بیرسٹری کی تعلیم مکمل کر کے جناب محمد علی جناح واپس آئے لیکن اس وقت وہ سیاست میں گلیڈسٹون، مارلے اور دادا بھائی نوروجی کے

مسلم لیگ کا قیام

۱۹۰۶ء کے اواخر میں مسلمانوں کے دینی، معاشرتی اور سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے ڈھاکہ میں "آل انڈیا مسلم لیگ" کا قیام عمل میں آیا۔ جداگانہ طریق انتخاب کے مطالبے اور مسلم لیگ کے قیام کو ہندوؤں نے اپنی مخصوص عینک سے دیکھا اور اسے "فرقہ پرستی" کا نام دیا اور صورت حال یہ تھی کہ "ہندی قومیت" کا ظاہری روپ تو غیر فرقہ وارانہ تھا لیکن اس کی باطنی روح ہندو امنگوں اور ہندو قوم کی عظمت کے نشے میں سرشار تھی۔ چنانچہ جب کبھی مفادات کے تصادم کی نوبت آتی (دور حاضر کی طرح) ہندی قومیت کے چہرے کی نقاب اتر جاتی اور ہندوؤں کی طرف سے سخت قسم کی فرقہ واریت کا مظاہرہ ہوتا۔

تقسیم بنگال کی تنسیخ

خالص انتظامی وجوہ کی بنا پر ۱۹۰۵ء میں وائسرائے لارڈ کرزن نے صوبہ بنگال کی سرحدوں کا از سرنو تعین کیا اور اس کے مشرقی حصے کو آسام میں شامل کر کے مشرقی بنگال اور آسام پر مشتمل ایک نیا صوبہ بنا دیا۔ اس نئے صوبے میں اتفاق سے مسلمانوں کی اکثریت ہو گئی چونکہ ہندو بنگالیوں کے ٹھاٹ باٹ اور عیش و تنعم کا دارومدار مشرقی بنگال کے مسلم کاشتکاروں کے استحصال پر تھا اس لیے انہوں نے اس اقدام کو اپنے ثقافتی اور معاشی غلبے کے لیے خطرہ قرار دیا اور اس کے خلاف پرزور احتجاج شروع کر دیا۔ برطانوی مصنوعات کے بائیکاٹ اور متشددانہ

۱۔ ایک سبب تو یہ تھا کہ یہ بڑی حد تک ایک ہندو ادارہ تھی اور سر سید کو یقین تھا کہ اس جماعت کی طرف سے جتنے بھی مطالبات پیش کئے جائیں گے ان میں لامحالہ اکثریتی پارٹی کے مفادات کے تحفّظ کا خاص خیال رکھا جائے گا اور اقلیتی پارٹی کو صرف شو بوائے کی حیثیت حاصل ہو گی۔

۲۔ دوسری وجہ وہ سیاسی اور معاشرتی مشکلات تھیں جو ہندوستان میں نمائندہ حکومت کے قیام کے بعد تعداد کے عدم توازن سے پیدا ہو سکتی تھیں اور جنہیں سر سیّد نے بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔

جُداگانہ انتخاب کا مطالبہ

اگرچہ ۱۸۹۸ء میں سر سیّد کی وفات ہو گئی مگر نظریات و افکار کا جو پودا سر سیّد نے لگایا تھا وہ مدرسۃ العلوم علیگڑھ کی بدولت پھلتا پھولتا رہا اور مسلمانوں میں اپنے قومی مفادات کے تحفّظ کا خیال برابر ترقی پذیر رہا۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء میں سر آغا خاں کی زیر قیادت ایک مسلم وفد نے وائسرائے ہند لارڈ منٹو سے ملاقات کی اور مسلمانوں کی نمائندگی کے سلسلے میں ان سے مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کو اپنے نمائندوں کے انتخاب کا حق دیا جائے اس لیے کہ موجودہ صورت میں یہ بات ناممکن ہے کہ کبھی کسی مسلمان کا نام حکومت کی منظوری کے لیے پیش کیا جائے الّا یہ کہ تمام اہم معاملات میں وہ اکثریّت کا ہم نوا ہو۔ اس تجویز نے ہندوؤں کو مخالفت پر ابھارا اس لیے کہ وہ ایک لمحے کے لیے مسلمانوں کے قومی تشخص کو ہندوستان میں برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

جائے۔ سر سیّد کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے مشترک کوشش کرنا محال ہے۔ ان کا بیان ہے کہ انہی دنوں میں جبکہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا مسٹر شیکسپیر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب میری گفتگو سُن رہے تھے آخر کار انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سُنا۔ اس سے پہلے تم عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ مَیں نے کہا کہ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیمیافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔"

بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ سیّد نے جو پیش گوئی کی تھی وہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی اور دونوں قوموں میں خلیج بڑھتی ہی گئی۔

۱۸۸۵ء میں ایک ریٹائرڈ انگریز افسر ایلن اکیٹوین ہیوم کی تحریک پر والسرائے لارڈ ڈفرن کی رہنمائی میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا تو سر سیّد نے مسلمانوں کو اس جماعت میں شریک ہونے سے منع کر دیا اس کے دو اسباب تھے۔

کے وہ شہزادے جو کبھی مخمل وسنجاب کے بستروں پر آرام کیا کرتے در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے تھے مستقبل تاریک تھا اور کسی بھی گوشے سے روشنی کی کوئی کرن نمودار نہیں ہو رہی تھی کہ سر سیّد احمد خاں مسلمانوں کی قیادت کے لیے میدان میں اتر پڑے۔ سر سیّد کو قدرت نے زبردست قوت ارادی غیر معمولی فہم و تدبر اور خلوص و ایمان کی دولت سے مالامال کیا تھا وہ اپنے دو کے تقاضوں کو سمجھ رہے تھے اس لئے انہوں نے مسلمانوں کی بدحالی کو دور کرنے کے لئے یہ فیصلہ کیا کہ مسلمان اپنی دینی روایات سے وابستہ رہتے ہوئے جدید تعلیم حاصل کر کے حکومت کے اعلیٰ مناسب پر فائز ہوں۔ تاکہ ان کی یہ دست نگری دور ہو اور قوم کے لئے کوئی فلاح کی راہ پیدا ہو سکے۔ اس مقصد کے تحت انہوں نے علی گڑھ میں مدرستہ العلوم (کالج) کی بنیاد رکھی جو بعد میں جاکر "مسلم یونیورسٹی علی گڑھ" کے نام سے مشہور ہوا سر سیّد نے ایک اخبا بھی جاری کیا جس کے بیشتر مضامین ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی معاشرتی اصلاح سے متعلق ہوا کرتے تھے۔ ابتداء میں سر سیّد کا خیال تھا کہ برِ صغیر میں ہندو اور مسلمان مل جل کر زندگی بسر کر سکیں گے۔ لیکن مولف الطاف حسین حالیؔ "حیات جاوید" میں لکھتے ہیں کہ:

"۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سر برآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں اُردو زبان اور فارسی رسم الخط کو موقوف کرانے میں کوشش کی جاوے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی

اور مرمت شدہ مکانوں اور خستہ برآمدوں میں قابل رحم زندگی
کے دن کاٹ رہے ہیں اور روز بروز قرض کی دلدل میں زیادہ
دھنستے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ کوئی ہمسایہ ہندو قرض خواہ ان پر نالش
کرتا ہے اور مکان زمینیں جو باقی تھیں ان کے قبضے سے نکل
جاتی ہیں۔"

ملازمتوں میں مسلمانوں کے تناسب کے بارے میں ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے:

"۱۸۶۹ء میں ان محکموں کا یہ حال تھا کہ اسسٹنٹ انجینئروں کے
تین درجوں میں چودہ ہندو اور مسلمان صفر امیدواروں میں
چار ہندو دو انگریز اور مسلمان صفر سب انجینئروں اور سپروائزروں
میں چوبیس ہندو اور ایک مسلمان اوورسیروں میں تریسٹھ ہندو
اور دو مسلمان اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں پچاس ہندو اور مسلمان
معدوم ۱۸۵۲ء تک ۱۸۶۸ء تک جن ہندوستانیوں کو وکالت
کے لائسنس ملے ان میں ۲۳۹ ہندو تھے اور ایک مسلمان۔"

مختصر یہ کہ حکومت واقتدار سے محروم ہو جانے کے بعد جنوبی ایشیا
کے مسلمان سخت محرومی وبدحالی میں زندگی گزار رہے تھے۔ اپنے کھوئے
ہوئے اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے انہوں نے ۱۸۵۷ء میں حکومت
کے خلاف ہتھیار بھی اٹھائے۔ لیکن وہ اقدام بھی راس نہ آیا اور برادران
وطن کی غداری کی وجہ سے مسلمان ناکام ہو گئے وہ دور بھی عجیب دور تھا
ہر طرف یاس وحرماں کی حکمرانی تھی تخت اقتدار تختۂ دار میں تبدیل ہو چکا تھا دلی

اس خیال کے تحت وہ اس میدان میں پیچھے رہ گئے اور نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۸۰-۸۱ء میں ہائی سکولوں میں جہاں ہندو طلبہ کی تعداد ۳۶۶۸۶ تھی وہاں ان سکولوں میں مسلمان طلبہ کی تعداد ۳۶۳ تھی حکومت چھن جانے کے بعد مسلمان معاشی اعتبار سے بھی بہت بدحال ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر ہنٹر اپنی کتاب "دی انڈین مسلمانز۔ (THE INDIAN MUSALMANS) میں لکھتا ہے:

"مسلمانوں کو حکومت سے بہت شکایات ہیں ایک شکایت یہ ہے کہ حکومت نے ان کے لئے تمام اہم عہدوں کے دروازے بند کر دیے ہیں۔ دوسرے ایک طریقۂ تعلیم جاری کیا ہے جس میں ان کی قوم کے لئے کوئی انتظام نہیں تیسرے قاضیوں کی موقوفی نے ہزاروں خاندانوں کو جو فقہ اور اسلامی علوم کے پاسبان تھے بیکار اور محتاج کر دیا ہے چوتھی شکایت یہ ہے کہ ان کے اوقاف کی آمدنی جو ان کی تعلیم پر خرچ ہونی چاہیئے تھی غلط مصرفوں پر خرچ ہو رہی ہے۔"

آگے چل کر یہی مصنف لکھتا ہے:

"یہی لوگ کسی زمانے میں محلوں میں رہتے تھے، گھوڑے گاڑیاں اور نوکر چاکر موجود تھے اب یہ حالت ہے کہ ان کے گھروں میں جوان بیٹے اور بیٹیاں پوتے اور پوتیاں بھتیجے اور بھتیجیاں بھرے پڑے ہیں اور ان بھوکوں کے لئے ان میں سے کسی ایک کو زندگی میں کچھ کرنے کا موقع نہیں وہ منہدم

حلیف بن گئے اور جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ناکام ہو گئی تو انگریزوں نے اس کی ساری ذمہ داری مسلمانوں کے سر ڈال کر مسلمانوں کو بری طرح کچلنا شروع کیا اور ہندوؤں کو وفادار رعایا میں شمار کر کے ان پر اپنی نوازشوں کے دروازے کھول دیئے۔ سر ولیم ہنٹر ۱۸۷۱ء میں لکھتا ہے:

"ہند کے مسلمان اب بھی اور سالہا سال سے برطانوی اقتدار کے لیے ایک مستقل خطرہ بنے ہوئے ہیں کسی نہ کسی وجہ سے وہ ہمارے نظام سے علیحدہ اور دور رہے ہیں اور جن تبدیلیوں کے سامنے موقع شناس ہندوؤں نے بڑی خوش دلی سے سر تسلیم خم کر دیا ہے مسلمان انہیں شدید ظلم قرار دیتے ہیں۔"

انگریزوں کے اس نظریے سے فائدہ اٹھا کر ہندو دھڑا دھڑ سرکاری ملازمتوں کے ان عہدوں کو پر کرنے لگے جو انگریزوں نے ہندوستانیوں کے لیے خالی چھوڑے تھے۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ مسلمانوں کے دور حکومت میں سرکاری زبان فارسی تھی لیکن انگریزوں نے لارڈ میکالے کی تجویز پر فارسی کے بجائے انگریزی کو دفتری زبان قرار دیدیا۔ چونکہ ہندوؤں کے نزدیک یہ ایک غیر ملکی زبان کی جگہ دوسری غیر ملکی زبان کی تبدیلی تھی اس لیے انہوں نے بغیر کسی پس وپیش کے انگریزی کو اختیار کر لیا مسلمانوں کے لئے یہ فیصلہ سخت مضر ثابت ہوا کیونکہ انہوں نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ اپنی دینی روایات سے دور جا پڑیں گے اور رفتہ رفتہ ذہنی طور پر وہ انگریزوں کے غلام بن کر رہ جائیں گے۔

ہاں کسی شمار میں نہیں ہے۔ (آل عمران : ۲۸)

چنانچہ جب کبھی بھی مسلمانوں نے قرآن کریم کے بتائے ہوئے اس راستے سے انحراف کیا انہیں سخت دھوکا کھانا پڑا اور کچھ ہی دنوں کے بعد ان پر یہ حقیقت آشکارہ ہو گئی کہ کفر و اسلام کا ملاپ اسی طرح ناممکن ہے جس طرح آگ اور پانی کا اجتماع شہنشاہ اکبر نے اپنے عہد حکومت میں سر توڑ کوشش کی کہ برصغیر میں مشترکہ قومیت کی بنیاد ڈالے اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے کیا کچھ نہیں کیا! نیا دین ایجاد کیا۔ اسلامی شعائر کی توہین کی۔ علمائے دین کو ہدفِ ملامت بنایا۔ بت خانوں کی سرپرستی کی۔ سورج کی پرستش کی لیکن سب کچھ بیکار ثابت ہوا اور ہندوؤں نے سلطنت مغلیہ کو پورے طور پر جمنے نہ دیا۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اکبری الحاد کے خلاف آواز اٹھائی اور نہایت صریح اور واضح الفاظ میں اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا کہ کفر و اسلام باہم متحد نہیں ہو سکتے اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"پس اسلام کی عزت کفر اور کافروں کی خواری میں ہے۔ جس نے اہل کفر کو عزیز رکھا اس نے اہل اسلام کو خوار کیا۔"

سرسیّد اور دو قومی نظریہ

مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد برعظیم جنوبی ایشیا میں ایک تیسرا فریق نمودار ہوا اور تجارت و مکاری کے ذریعہ انگریزوں نے یہاں کے اقتدار پر قبضہ کر لیا، جوں ہی یہ صورت حال پیدا ہوئی یہاں کے ہندو انگریزوں کے

بھی اضافہ ہوتا جائے گا اور یہ چیز بالآخر ہم سب کی تباہی کا باعث ہو گی۔ ہندو اور مسلمان نہ آپس میں شادی بیاہ کر سکتے ہیں نہ ایک دستر خوان پر بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہیں دونوں کے فلسفہ حیات نہ صرف ایک دوسرے سے مختلف بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہیں ایک قوم کے سورما دوسری قوم کی نظر میں دشمن ہیں۔ ہر قوم دوسری کی فتوحات کو اپنی شکست تصوّر کرتی ہے۔ ایسی حالت میں دونوں کو ملا کر ایک قوم بنانے کی کوشش جس کے لازمی نتیجے میں عددی اکثریّت عددی اقلیّت پر غالب رہے گی صرف بدامنی اور تباہی کی موجب ہو سکتی ہے۔"

قائدِ اعظمؒ کا یہ نظریہ کوئی نیا نظریہ نہیں تھا بلکہ یہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ اسلام جس دن سے فاران کی چوٹی سے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمہ حق بلند کیا اسی دن سے دنیا میں دو واضح جماعتیں بن گئیں ایک جماعت خدا پرستوں کی اور دوسری باطل پرستوں کی اور اسی وقت سے حق و باطل، نور و ظلمت اور ہدایت و ضلالت کے درمیان آویزش شروع ہو گئی تھی۔ اور قرآن کریم میں واضح الفاظ میں مومنوں کو حکم دیدیا گیا کہ:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ	مومنوں کو نہ چاہیے کہ مومنوں
الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ	کے ہوتے ہوئے کافروں
الْمُؤْمِنِيْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ	کو اپنا دوست بنائیں اور جو
فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ	کوئی ایسا کرے گا تو وہ اللہ کے

کی پرستش کرتے ہیں مسلمانوں کو قرآن حکیم میں ان مظاہر کو مسخر کرنے اور اپنے مقاصد کی تکمیل میں ان سے خدمت لینے کا حکم دیا گیا ہے۔

۶۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے نظامہائے معاشرت بھی باہم متضاد ہیں ہندوؤں کی قومیت و معاشرت کی بنیاد ذات پات اور چھوت چھات پر ہے جبکہ مسلمانوں کی معاشرت مساوات و اخوت ایمان و تقویٰ عمل صالح اور عالمگیر فلاحی تصورات پر مبنی ہے۔

۷۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے رسم و رواج تاریخ، تصورِ تاریخ، تعمیر، فنون لطیفہ، ادب و شاعری، تحریر و زبان، خوراک و بود و ماند غرضکہ ہر چیز میں نہ صرف یہ کہ اختلاف ہے بلکہ اکثر تضاد پایا جاتا ہے۔

اسی لیے قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے فرمایا تھا کہ؛

"ہمارے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ہمارے ہندو دوست اسلام اور ہندو مذہب کی اصلیت اور حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے ہندو مت اور اسلام صرف اصطلاحی معنوں میں دو جداگانہ مذاہب نہیں بلکہ دو ممتاز اور بالکل مختلف سماجی اور معاشرتی نظام ہیں اور یہ سوچنا کہ ہندو اور مسلم مل کر کبھی ایک واحد قومیت کی تشکیل کر سکتے ہیں ایک خوش آئند خواب سے زیادہ نہیں متحدہ ہندوستانی قومیت کے خیالات میں کھو کر ہم معقول حدوں سے بہت آگے بڑھ چکے ہیں اگر ہم نے جلد ان خیالات پر نظر ثانی نہ کی اور حقائق سے گریز کیا تو ہمارے مصائب میں اور

کیا وجہ ہے کہ باوجود اسلام کی بے مثال رواداری اور اعلیٰ تعلیمات کے یہاں کی اکثریت کے دلوں سے کدورت دور نہ ہو سکی ؟

تفصیلات کی گنجائش نہیں ہے پھر بھی چند باتیں قابلِ غور ہیں ۔

۱ ۔ اسلام اور ہندو مت کے فلسفے میں بنیادی فرق ہے ۔ اسلام توحید کا دین ہے اور ہر تشبیہ و تمثیل سے مبرّا ہے لیکن ہندو مت تشبیہ و تمثیل کا مذہب ہے ۔ اس لیے اس کے معبود بھی بے شمار ہیں ۔

۲ ۔ ہندو مت دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں شمار ہوتا ہے جبکہ انسانیت کا ذہن پورے طور پہ بالغ بھی نہیں ہوا تھا اور اسلام تمام ادیان کو منسوخ کرنے والا ہے اور یہ دین اس وقت دنیا کو دیا گیا جبکہ فکری اعتبار سے عالمِ انسانیت کا دماغ بالغ ہو چکا تھا ۔

۳ ۔ اسلام میں حیات بعد الموت اور یوم قیامت کے عقیدے کو بنیادی حیثیّت حاصل ہے جس سے انسان میں احساس ذمہ داری اور جوابدہی کا شعور ابھرتا ہے جبکہ ہندو مت انسانی زندگی کو تناسخ (آواگون) کے گورکھ دھندے میں پھنسا کر چھوڑ دیتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو آخرت کا کوئی واضح تصوّر نہیں دیتا ۔

۴ ۔ اسلام کے تمام عقائد کی بنیاد وحی و تنزیل پر ہے جبکہ ہندو مت میں وحی و تنزیل کا کوئی واضح تصوّر موجود نہیں ہے ۔

۵ ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا نظریہ عبادت بھی مختلف ہے ہندو جن مظاہر فطرت (ستارے ۔ چاند ۔ سورج ۔ پہاڑ ۔ دریا ۔ درخت ۔ گائے)

مغلوب ومحکوم نہیں سمجھا۔ وہ کاروبار حکومت میں برابر کے شریک رہے۔ وہ فوج کے کمانڈر اور حکومت کے وزیر مقرر کئے جاتے تھے بلکہ اکثر مالیات کا محکمہ انہیں کے ہاتھ میں ہوتا۔ جاگیردار اور امراء کے طبقے میں بھی ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ شہروں قصبوں اور گاؤں میں ہندو اور مسلمان مل جل کر رہتے۔ ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں شریک ہوتے لیکن مسلمانوں کی اس تمام رواداری، مراعات اور مساویانہ سلوک کے باوجود ہندوؤں کے دل سے مسلمانوں سے نفرت اور عناد دور نہ ہوا، اور وہ ہمیشہ مسلمانوں کو اچھوت اور ملیچھ سمجھتے رہے چھوت چھات کے نظریے نے انہیں ہمیشہ مسلمانوں سے دور رکھا شہنشاہ اکبر نے ہندو نوازی کی جو پالیسی اختیار کی اس سے بھی ہندو متأثر نہ ہوئے اور مسلمانوں سے نفرت ان کے باطن میں جاگزیں رہی۔

حقیقی اسباب

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ باوجود اتنی فراخ دلی اور مساویانہ برتاؤ کے ہندوؤں کے دلوں سے مسلمانوں کی نفرت دور نہ ہو سکی۔ مسلمان فاتح کی حیثیت سے صرف ہندوستان ہی میں داخل نہیں ہوئے تھے انہوں نے روم و ایران اور مصر کی حکومتوں کو بھی میدان جنگ میں شکست دی تھی لیکن ان مفتوحہ علاقوں کے غیر مسلم عوام نے اسلام کو آیت رحمت سمجھا اور اسے نہایت خندہ پیشانی سے نہ صرف یہ کہ قبول کر لیا بلکہ اس کا پیغام لے کر دنیا کے مختلف علاقوں میں پھرتے رہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کی

ذاتی اپج کی بنا پر نہیں کئے تھے بلکہ قرآن کریم کی تعلیم ہی یہ ہے کہ دین کے معاملے میں کسی پر جبر نہ کیا جائے۔ البتہ حق و باطل کی نشاندہی کر دی جائے اور پھر فیصلہ انسان کے اپنے ضمیر پر چھوڑ دیا جائے۔ اگر وہ برضا و رغبت بلا جبر و اکراہ اسلام کے دامنِ رحمت میں پناہ لینا چاہے تو خوشدلی سے اس کا استقبال کیا جائے اور اگر وہ مسلمانوں کی حکومت میں اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارنا چاہے تو اسے پوری آزادی اور رواداری کے ساتھ اپنے طور پر زندگی گزارنے کا موقع فراہم کیا جائے۔

جنوبی ایشیا کے مسلم حکمران اسی اصول پر کاربند رہے اور یہاں کی غیر مسلم آبادی کے ساتھ میل جول سے رہنے لگے۔ انہوں نے اپنی عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کو یہاں کی مقامی بھاشاؤں کے ساتھ ملا کر ایک نئی زبان اردو کو جنم دیا یہاں کے فلسفے آرٹ اور شاعری کا گہرا مطالعہ کیا اور ان کی سرپرستی کی اور برصغیر پر انہوں نے سب سے بڑا احسان یہ کیا کہ مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹے ہوئے ہندوستان کو ایک جغرافیائی وحدت عطا کی۔ یہاں کے عوام کی اقتصادی معاشی اور معاشرتی بدحالی کو دور کرنے کی کوشش کی اور تاریک دور میں زندگی بسر کرنے والے ہندوستان کو شرافت و شائستگی کا ماحول عطا کیا۔ اس حقیقت کا اعتراف خود بھارت کے سابق صدر راجندر پرشاد نے اپنی کتاب INDIA DIVIDED میں ان الفاظ میں کیا ہے:

"مسلم فاتحوں کا طرزِ عمل بحیثیت مجموعی رواداری کا آئینہ دار تھا"

مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ دورِ حکومت میں ہندوؤں نے خود کو کبھی بھی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برصغیر پر مسلمان حکمرانوں نے تقریباً آٹھ سو برس تک پرشکوہ حکومت کی۔ اس تمام عرصے میں مسلم حکمرانوں نے اسلام کے تابندہ اصولوں کے تحت غیر مسلم رعایا کے ساتھ انتہائی فراخ دلی کا برتاؤ کیا۔ مذہبی معاملات میں ان سے رواداری برتی۔ معاشرت میں ان سے مساویانہ سلوک کیا۔ اس لیے کہ انہوں نے اس سرزمین کو اپنا وطن بنا لیا تھا انگریزوں کی طرح انہوں نے اس ملک کو ایک کالونی نہیں بنایا اور نہ اس بات کی کوشش کی کہ یہاں کی تہذیبی روایات کو مسخ کریں۔ یہ الگ بات ہے کہ جب دو تہذیبیں ملتی ہیں تو غیر شعوری طور پر کچھ لینے اور کچھ دینے کا عمل ہوتا ہے۔ مسلمان صوفیہ اور علماء نے اپنے کردار و افکار سے یہاں کے عوام کو متاثر کیا وہ دور دراز کے علاقوں میں توحید کی روشنی اور نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ کی پاک سیرت کا نمونہ لے کر گئے جس سے یہاں کے غیر مسلم عوام جو عرصہ دراز سے ذات پات کے بندھنوں میں اسیر تھے متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ مختلف گوشوں میں اسلام پھیلنے لگا۔ اسلام نے اپنی آغوش رحمت ہر ستم رسیدہ اور کچلے ہوئے انسان کے لیے کھول دی۔ عالی و دانی اور اونچ نیچ کے امتیازات مٹنے لگے۔ اس کے باوجود مسلم حکمرانوں نے کسی پر جبر نہیں کیا اور نہ کسی غیر مسلم جماعت کو اپنے مذہبی فرائض کی انجام دہی سے روکا۔ نہ صرف ہندوؤں بلکہ پارسیوں اور گوتم بدھ کے ماننے والوں کی عبادت گاہوں کی بھی حفاظت کی۔ ان معابد کے لیے جاگیریں وقف کی گئیں اور ان کا اہتمام و انصرام بھی انہی لوگوں کے ہاتھ میں دیا گیا۔ مسلمان حکمرانوں نے یہ اقدامات کسی وقتی جذبے یا کسی



بانیٔ پاکستان قائدِ اعظمؒ
(ستمبر ۱۹۴۴ء میں گاندھی کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔)

'We maintained and hold that Muslims and Hindus are two major Nations by any definition or test of a nation. We are a nation of a hundred million, and what is more, we are a nation with our own distinctive culture and civilisation, language and literature, art and architecture, names and nomenclature, sense of value and proportion, legal laws and moral codes, customs and calender, history and traditions, aptitudes, and embitions In short, we have our own distinctive outlook on life and of life. By all canons of international law we are a nation.'

ہمارا یہ عقیدہ ہے اور ہم اس پر قائم ہیں کہ قومیّت کی کسی بھی تعریف و معیار کی رُو سے مسلمان اور ہندو دو (علیحدہ علیحدہ) بڑی قومیں ہیں۔ ہماری قوم دس کروڑ افراد کی قوم ہے مزید برآں یہ کہ ہم اپنے مخصوص تمدّن و تہذیب، زبان و ادب، فنونِ لطیفہ و تعمیرات، اسماء و اصطلاحات، تخیلِ اقدار و تناسب، عدالتی قوانین و اخلاقی ضوابط، رسوم و رواج، سنین و تواریخ، روایات و عقائد، میلانات و عزائم غرضیکہ ہر اعتبار سے ہمارا ایک جداگانہ تصوّرِ حیات ہے لہٰذا بین الاقوامی قانون کے تمام اصولوں کے مطابق ہم ایک مستقل بالذات قوم ہیں۔

سلسلہ مطبوعات مرکزِ تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری — ٦

دو قومی نظریہ

الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور ۝ (الحج ۴۱)

ترتیب

مولانا سید محمد متین ہاشمی

ریسرچ ایڈوائزر

مرکزِ تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری

نسبت روڈ ○ لاہور